

# Downloaded From Paksociety.com



منی ناول

ہم کو عبث بدنام کیا

سیما سردا



تیسرا حصہ

بالآخر مسلسل ہوتی موبائل فون کی بیل پر ریال نے فون ریسیو کر لیا تھا۔  
”ہیلو.....“  
”ہیلو..... وغیرہ کو رہنے دو بس اتنا سنو کہ صرف دو گھنٹے ہیں تم ماں، بیٹا کے پاس..... اس کے بعد ہم دھکے مار کر تمہیں اس گھر سے نکال دیں گے۔“ دوسری طرف خالہ زینب تھیں جو کرخت انداز میں کہہ رہی تھیں اور ریال تا سبھی کے عالم میں امی کو دیکھ رہا تھا۔

ماہنامہ پاکیزہ 148 دسمبر 2016ء



ہیں انہیں اس بات کا احساس تو تھا مگر اس قدر گریہ جاتے ہیں اس بات کا انہیں اندازہ ہی نہیں تھا۔

”نکاح کے پیپر سائن کروانے سے پہلے انہوں نے ایک اور کاغذ پر مجھ سے دستخط لیے تھے۔ میرا دھیان آپ کی طرف تھا اسی لیے پڑھے بغیر ہی سائن کر دیا تھا۔“

”اُف.....“ امی ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئی تھیں۔ ”اب کیا ہوگا..... یہ گھر تمہارے ابا نے بڑی محنت سے بنایا تھا۔ ان کا خواب تھا کہ اس گھر میں ان کے بچوں کے بچے کھیلیں، اپنی شرارتوں کے ساتھ پروان چڑھیں مگر اب.....“

”کچھ نہیں ہوگا امی..... آپ فکر نہیں کریں۔“ ریحال، امی کو افسردہ ہوتا دیکھ کر فوراً بولا۔ ”میں خالہ نزنب سے بات کرتا ہوں۔“

”کوئی فائدہ نہیں، اس کے دل میں جو ایک بات آجائے وہ پھر پتھر کی لکیر ہو جاتی ہے۔ ہم نے جو عروج کے ساتھ فی الحال نکاح سے منع کیا اس نے بدلہ تو لینا ہی تھا۔“ امی کہہ کر اسے دیکھنے لگیں۔ ”کب تک کا وقت دیا ہے؟“

”دو گھنٹے کا۔“

”وقت اور مانگ لو..... اتنی جلدی تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔“ امی کہہ کر کمرے میں چلی گئی تھیں جبکہ وہ عجیب شش و پنج میں بیٹھا جانے کیا سوچنے لگا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے موبائل فون اٹھا کر خالہ نزنب کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

☆☆☆

اعزاز شاہ بستر پر اوندھے لیٹے تھے ان کے خراٹوں کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی..... کچھ دیر پہلے زوار شاہ نے آفس جانے سے پہلے ان کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تھا اور انہیں یوں سوتا دیکھ کر ان کے دل میں ایک عجیب سی لہرائی تھی جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکتے تھے اور وہی لہرائی انہیں پریشان کر گئی تھی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”مطلب یہ ہے بیٹا کہ میری بیٹی سے انکار کی صورت، تم اس گھر سے بے دخل ہو چکے ہو جو کبھی تمہارا تھا۔“

”لیکن یہ تو میرا گھر ہے۔“ وہ چیخا تھا اور دوسری طرف خالہ قہقہہ لگا کر ہنسی تھیں۔

”کچھ اسی طرح کا غصہ مجھے بھی کل آیا تھا مگر اب میں ضبط ستھٹی ہوں اور تمہیں دو گھنٹے کا وقت دے رہی ہوں، گھر خالی کر دو ورنہ ہم قانون کا سہارا لیں گے۔“

”اگر آپ یہ مذاق کر رہی ہیں خالہ تو.....“

”یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔“ خالہ نزنب اس کی بات کاٹ کر فوراً بولیں۔ ”تم نے اپنا گھر خود اپنی مرضی سے میری بیٹی عروج کے نام کر دیا ہے اور اس کا ثبوت وہ کاغذ کا ٹکڑا ہے جو تمہارے سائن کے ساتھ میرے پاس موجود ہے۔“ خالہ نزنب ایک، ایک لفظ پر زور دیتی ہوئی کہہ رہی تھیں اور اسے جیسے یقین نہیں آرہا تھا گو کہ اسے ساری پلاننگ سمجھ آ گئی تھی اور یہ بھی کہ وہ کہاں غلطی کر آیا تھا عین نکاح کے وقت اس سے ایک کاغذ سائن کر دیا گیا تھا جواب یہ مصیبت کھڑی کر رہا تھا۔

”کیا ہوا ہے؟“ اس کے فون بند کرتے ہی امی نے بے مبری سے پوچھا تھا۔ اس کے پریشان چہرے سے وہ بہت کچھ قیاس کر چلی تھی لیکن پھر بھی اس کے منہ سے سننے کے لیے بے قرار ہو رہی تھیں۔ وہ گہری سانس لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

”بولو کیا ہوا ہے سب ٹھیک تو ہے ناں.....؟“ وہ آہستہ، آہستہ نفی میں سر ہلانے لگا۔

”کچھ بھی ٹھیک نہیں رہا..... نزنب خالہ نے یہ گھر اپنے نام کر دیا ہے۔“

”کیا..... پر کیسے؟“ وہ سخت الجھن و بے یقینی کے عالم میں تھیں، خونی رشتے کتنی جلدی بدل جاتے

ماہنامہ پاکیزہ 150 دسمبر 2016ء



کہ اس سے کہے۔ ”میں اس سے بھی زیادہ رقم چاہیے دیتا ہوں تم، اسے اپنے پاس ہی رکھو۔“ مگر وہ یہ بات دل میں ہی دبا گئے کیونکہ ان کی شرافت ان کے آگے آگئی تھی۔ اعزاز شاہ نے کچھ سوچ کر جس نمبر سے کال آئی تھی اس نمبر کو دیکھا تھا اور پھر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ وہ کوئی معمولی حیثیت کے شخص تو نہیں تھے جو پریشان ہو جائے اور نہ ہی پچاس لاکھ ان کے لیے کوئی بڑی رقم تھی لیکن اغوا کرنے والے شاید اناڑی تھے جو اپنے موبائل نمبر سے انہیں دھمکی دے گئے تھے۔

وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر تیار ہو کر ڈانگ نیبل پر ناشتا کرنے آ بیٹھے۔ خانساہاں نے فوراً ان کے آگے ناشتا رکھ دیا تو وہ توس پر جیم لگانے لگے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے موبائل فون سے وانیہ کے موبائل نمبر ڈائل کیے تھے لیکن دوسری طرف نمبر بند ہونے کی اطلاع موصول ہوئی تھی، انہوں نے ایک لمحہ سوچتے کے بعد زوار شاہ کا نمبر ڈائل کیا۔

”ہیلو بیٹا.....“ انہوں نے بہت عجلت میں کہا تھا شاید وہ بہت زیادہ مصروف تھے۔ ”بولو کوئی خاص بات؟“

”جی پاپا.....“  
”تو جلدی کہو میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔“

”پاپا وانیہ کو کڈ نیپ کر لیا ہے۔“  
”کیا؟ تم ہوش میں تو ہو؟“ انہیں شاید یقین نہیں آیا تھا اس لیے ان کی دماغی حالت پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے بولے۔ ”وہ کوئی معمولی آدمی کی بیٹی ہے نہ بہو۔“

”میں جانتا ہوں اس لیے میں خود بھی حیران ہوں۔“ وہ فوراً بولے۔

”اچھا تم ایسا کرو..... آفس پہنچو..... پھر بات کرتے ہیں۔“ انہوں نے کہتے ہی سلسلہ منقطع کر دیا

ماہنامہ پاکیزہ 151 دسمبر 2016ء

یہ نہیں تھا کہ انہیں اپنے بچوں سے محبت نہیں تھی... یہ بے تحاشا دولت انہوں نے اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے ہی جمع کی تھی اور اس میں ان کی دن رات کی محنت شامل تھی۔ اب تو انہیں اپنا آپ ایک مشین لگنے لگا تھا اس وقت اعزاز شاہ کو سوتا دیکھ کر ان کی محبت جاگ اٹھی تھی، ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ انہیں نیند سے بیدار کر کے اس سے خوب باتیں کریں اور وہ ایسا کر بھی گزرتے جو آفس میں ایڈیٹر کی جگہ خالی ہونے پر انہیں انٹرویو نہ کرنے ہوتے۔ وہ بہت آہستہ سے دروازہ بند کر کے آگے بڑھ گئے تھے۔

اعزاز شاہ نے کسمسا کر آنکھ کھول کر گھڑی کی طرف دیکھا تھا اور پھر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ گوکہ یہ وقت ان کے اٹھنے کا نہیں تھا لیکن پیٹ میں اچانک سے اٹھتے درد نے انہیں نیند سے بیدار کر دیا تھا۔ اعزاز شاہ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو دبایا تھا۔ پھر دراز میں سے اپنی خاص ٹیبلٹ نکال کر منہ میں رکھی اور سائڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے پانی گلاس میں ڈال کر گلاس منہ سے لگا لیا تھا۔ کچھ دیر بعد انہیں قدرے سکون محسوس ہوا تھا۔ یہ تکلیف انہیں پچھلے کچھ دنوں سے ہو رہی تھی اور وہ ڈاکٹر کے پاس جانے کے بجائے اپنی دوا تجویز کر رہے تھے۔

”آج ڈاکٹر کے پاس ضرور جاؤں گا۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں کہتے ہوئے واش روم کی طرف بڑھ گئے۔ وہ نہا کر فریش ہونا چاہتے تھے لیکن مسلسل ہوتی موبائل فون کی بیل نے انہیں مجبوراً واش روم سے باہر نکالا۔

”جی.....“ اعزاز شاہ نے تلخی کے ساتھ کہا تھا لیکن دوسری طرف اس کی تلخی کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔  
”تمہاری بیوی ہمارے قبضے میں ہے اگر اس کی خیر خیریت چاہتے ہو تو پچاس لاکھ کا انتظام کر رکھو..... میں پھر فون کروں گا۔“ اس نے اپنی بات کہہ کر فون بند کر دیا تھا جبکہ اعزاز شاہ کا دل چاہا تھا



www.paksociety.com

تھا۔ انہوں نے اطمینان سے چائے پی اور پھر آفس کے لیے نکل گئے تھے۔

☆☆☆

”فیضان..... وانیہ کہاں ہے؟“

”معلوم نہیں۔“

”میں نے تم سے کہا تھا اس پر نظر رکھو۔“

”جی میں نے اپنے دو آدمی اس پر نظر رکھنے کے لیے مامور کیے ہیں۔“

”یہ کیسی نظر رکھی ہے کہ وہ کڈنیپ ہو گئی ہے۔“

زوارشاہ تقریباً چیخے تھے۔

”کیا؟“ دوسری طرف بے یقینی کی کیفیت تھی۔

”آپ سے کس نے کہا ہے؟“

”اعزاز شاہ نے۔“

”میں معلوم کرتا ہوں۔“

”جلدی معلوم کرو..... یہ ہماری خاندان کی

عزت کی بات ہے اور جو بھی رپورٹ ہے ہمیں جلدی

فراہم کرو۔“

”آپ بے فکر ہو جائیں۔“ اس کے ساتھ ہی

زوارشاہ نے سلسلہ منقطع کر دیا تھا اور کرسی کی بیک سے

ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

وہ کافی عرصے سے وانیہ کی مشکوک حرکتیں دیکھ

رہے تھے اور اعزاز شاہ سے ہونے والے جھگڑے

کی آوازیں بھی وہ بغور سن رہے تھے لیکن ابھی تک

خود خاموش تھے تو صرف اسی وجہ سے کہ وہ اب اس

معاملے کو کسی نتیجے پر پہنچانا چاہتے تھے اس لیے

انہوں نے فیضان شاہ سے وانیہ پر نظر رکھنے کو کہا تھا

لیکن اب اس کے اغوا ہو جانے پر مسئلہ الجھ گیا تھا،

ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اچانک کیا ہو گیا

ہے۔ وہ ابھی اسی سلسلے کو سلجھانے میں لگے تھے کہ

اچانک ہلکی سی دستک کے بعد ان کے روم میں اعزاز

شاہ داخل ہوئے تو انہوں نے ذرا سی آنکھیں کھول

کر انہیں دیکھا پھر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے انہیں

ماہنامہ پاکیزہ 152 دسمبر 2016ء

بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”بیٹھو اور اب بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟“

”معاملے کا تو مجھے خود نہیں پتا..... بس کچھ دیر

پہلے میرے پاس فون آیا تھا۔“

”کیسا فون.....؟“ انہوں نے فوراً پوچھا۔

”یہی کہ اگر اپنی بیوی کی خیریت چاہتے ہو تو

پچاس لاکھ کا انتظام کرو۔“

”یا؟“ انہوں نے طنز سے سر جھٹکا۔ ”کسی نے

مذاق کیا ہوگا۔“

”مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا مگر وانیہ کا نمبر مسلسل آف

آ رہا ہے۔“

”اس کی بے پروائی کا تمہیں پتا ہے موبائل کہیں

رکھ کر بھول گئی ہوگی یا کہیں پھینک دیا ہوگا۔“

”مگر ایسا اس وقت ہوتا ہے جب وہ بہت غصے

میں ہو اور ویسے بھی وہ لاہور کے لیے نکلی تھی۔“ اس نے

ان کی بات کو رد کر دیا تھا وہ کچھ دیر انہیں دیکھتے ہوئے

شاید ان کی کیفیت سمجھنا چاہ رہے تھے۔

”تمہیں کسی پر شک ہے.....؟“

”نہیں.....“

”ٹھیک ہے پھر تم کڈمچر کا انتظار کرو..... میرا

مطلب ہے ان کے فون کا..... کیونکہ پھر ہم اندازہ

لگا سکتے ہیں کہ وہ کون ہیں اور وہ صرف پیسے سے

مطلب رکھتے ہیں یا کوئی اور مطالبہ کرتے ہیں۔“

ان کی آخری بات سن کر اعزاز شاہ اپنی جگہ سے اٹھ

کھڑے ہوئے تھے۔

”ٹھیک ہے۔“ اعزاز شاہ کے وہاں سے

جاتے ہی زوارشاہ پھر کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے

تھے۔ انہوں نے جس طرح اپنی طرف سے بچوں کی

تربیت میں کہیں کوئی کمی نہیں رکھی تھی اسی طرح وہ ان

کی حرکتوں سے غافل بھی نہیں ہونا چاہتے تھے ان کی

مثال ایسی ہی تھی کہ وہ کھلاتے سونے کا نوالہ تھے مگر

دیکھتے شیر کی نظر سے تھے، اسی لیے ان کے کسی بھی



”کیا میں تانیہ سے بات کر سکتی ہوں؟“ اس کی آواز کے بوجھل پن کو محسوس کرتے ہوئے دوسری طرف سے محتاط انداز میں پوچھا گیا تو وہ قدرے توقف کے بعد سنبھل کر بولی۔

”جی..... کہیے میں بات کر رہی ہوں۔“  
”آپ نے جاب کے سلسلے میں اپنی سی وی بھیجی تھی۔“

”کون سی کمپنی.....؟“ وہ سوچتے ہوئے انداز میں بولی۔ ”میرا مطلب ہے آپ کس کمپنی سے بات کر رہی ہیں۔“

”فلاں..... ایڈورٹومنٹ کمپنی سے بات کر رہی ہوں۔ زوارشاہ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔“  
”جی، جی میں جانتی ہوں، آپ اگر ان سے کل

کا وقت لے کر دے دیں تو میں آ جاؤں گی۔“  
”جی.....! میں نے بھی آپ کو اسی لیے فون کیا تھا کہ آج انہوں نے انٹرویو کینسل کر دیے ہیں اور کل ہی سب کو بلایا ہے۔“

”کوئی خاص وجہ.....؟“ وہ جاننا چاہتی تھی کہ تانیہ اعزاز کے اغوا ہونے کی اطلاع انہیں مل گئی ہے یا نہیں..... لیکن دوسری طرف سے لاعلمی کے اظہار کے ساتھ ہی فون بند کر دیا گیا تھا۔

روزی کی سوچ کو ایک نیا رخ ملا تھا وہ سب کچھ بھول کر اب اپنے لیے سوچنے لگی تھی۔ وہ لاہور جانے سے پہلے مختلف کمپنیز میں اپنا سی وی ڈراپ کر کے آئی تھی گو کہ اسے جاب کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ زوارشاہ تک رسائی حاصل کرنا چاہتی تھی اور وہ ان کے شاطر دماغ کو اچھی طرح سمجھتی تھی اس لیے وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی اور اپنا نام تانیہ اور ایڈریس بھی دوسرے محلے کا دے کر وہ مطمئن تھی بس اسے اپنا حلیہ بھی اسی محلے کا بنانا تھا۔ لیکن اس سے پہلے اسے یہاں سے نکلنا تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد موبائل فون اٹھا کر فیضان شاہ کا نمبر ڈائل کیا۔

بچے نے آج تک ان کی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا تھا مگر کچھ کام ایسے بھی تھے جو زوارشاہ کی نظروں سے پوشیدہ تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی بچوں کے لیے کمانے اور انہیں اسٹیمپلش کرنے میں صرف کردی اگر وہ کچھ وقت اپنے بچوں کو دیتے تو شاید وہ اتنی بے راہ روی کا شکار نہیں ہوتے ان کے بچوں کو سب کچھ میسر تھا مگر ذہنی سکون نہیں اور اسی کی تگ و دو میں وہ بھٹکتے پھر رہے تھے۔ اچانک فون کی بیل پر زوارشاہ نے فوراً فون ریسیو کیا تھا وہ شاید فون کا ہی انتظار کر رہے تھے۔

”پاپا وانیہ کو ان لوگوں نے ہی اغوا کر لیا ہے جن کو اس پر نظر رکھنے کے لیے کہا گیا تھا۔“ فیضان شاہ نے جیسے ان کی سماعت پر ہم پھوڑے تھے۔

”تو تم کر کیا رہے ہو، فوراً ان کے خلاف ایکشن لو۔“ انہوں نے کہہ کر فون شیخ دیا تھا۔ ان کا ضبط جواب دے گیا تھا تو وہ چیخے تھے۔

☆☆☆

روزی کمرے میں مسلسل ٹہل رہی تھی، ڈپریشن سے اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا..... لاہور سے مسلسل کال آرہی تھی اور وہ اینڈ نہیں کر رہی تھی۔ سورج کی روشنی نے ہر سو پھیل کر لوگوں کو بیدار کر دیا تھا۔ وہ اس وقت سکون سے سونا چاہتی تھی مگر وانیہ کے اغوا ہوجانے کے بعد سے اسے ایک پل بھی چین نہیں آیا تھا۔ کمرے میں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی ابھی کچھ دیر پہلے ہی روزی نے کھڑکیوں پر بھاری پردے برابر کیے تھے جس کی وجہ سے کمرے میں مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

وہ بیڈ کے دائیں جانب کے سرے پر اپنے دونوں ہاتھوں میں سر تھاٹے بیٹھی تھی۔ وہ آج سے پہلے کبھی اتنی پریشان نہیں ہوئی تھی۔ اس سے ذرا فاصلے پر رکھا موبائل فون ایک بار پھر بجنے لگا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس بار اس نے کال ریسیو کر لی۔

”ہیلو.....“



”تم کیا کر رہی ہو؟“

”شامی کباب کا مسالا تیار کر رہی ہوں۔“

”یہ سب کام ہو جائیں گے تم میرے ساتھ آؤ۔“ تائی جی اس کا بازو پکڑے اسے اپنے ساتھ لیے اپنے کمرے میں آگئی تھیں۔ وہ حیران ہونے کے ساتھ ناگہی کے عالم میں انہیں دیکھنے لگی۔ تائی جی نے پہلے دروازہ بند کرنے کے ساتھ اسے فوراً لاک کیا پھر اس کے ساتھ بیڈ پر آ کر بیٹھ گئیں۔

”تمہیں پتا ہے کہ کون لوگ آرہے ہیں؟“

”جی، تایا جی نے بتایا تھا کہ ان کے دوست.....“

”ہاں.....“ وہ اس کی بات کاٹ کر فوراً بولیں۔ ”اور وہ تمہیں دیکھنے کے ساتھ مگنی کی انگلی پھنانے آرہے ہیں لیکن تم انکار کر دو۔“ انہوں نے فوراً ہی اپنی بات کی اور وہ سکتے کی حالت میں انہیں دیکھنے لگی اسے شاید اپنی ساعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

”میرا تمہارے سوا کون ہے بیٹی، تم بھی اس گھر سے چلی جاؤ گی تو میں بالکل اکیلی ہو جاؤں گی۔“ وہ گلوگیر لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ اور پھر تمہاری تعلیم بھی تو ہے بے شک تمہارے تایا نے ان سے بات کر لی ہو لیکن کون اپنی بہو کو یونیورسٹی بھیجنا پسند کرتا ہے اور پھر شادی کے بعد کتنے مسائل ہوتے ہیں، میں نے تو تمہارے تایا جی کو سمجھا کر دیکھ لیا مگر.....“ وہ قصداً بات ادھوری چھوڑ کر اسے سینے سے لگا کر رونے لگیں۔ اور تھمیرہ ہمیشہ کی ممتا کی ترسی ان کی چالاکی کو سمجھے بغیر ہی پگھل گئی تھی۔

”ٹھیک ہے تائی جی، آپ جیسا کہیں گی میں ویسا ہی کروں گی۔ میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔“

”جیتتی رہو۔“ وہ اسے خود سے الگ کر کے اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولیں۔ ”مجھے یقین تھا کہ تم ہی میری سگی اولاد ہو۔ میں نے ہمیشہ تمہیں اپنی

”ہیلو فیضان.....“ کال ریسیو ہوتے ہی وہ فوراً

بولی۔ ”ایک ایمر جنسی کی وجہ سے مجھے آدھے راستے سے واپس جانا پڑ رہا ہے، میں کراچی پہنچ کر تمہیں کال کروں گی۔“

”ٹھیک ہے کوئی مسئلہ نہیں.....“ اس نے نارمل سے انداز میں کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا تو روزی ایک لمحے کو ہنسی تھی لیکن پھر فوراً ہی سر جھٹک کر اپنا بیگ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

تائی جی کافی پریشانی سے کبھی ادھر تو کبھی ادھر ٹہل رہی تھیں۔ شام کو گھر میں مہمان بھی آنے تھے اور ابھی تک کوئی چیز بھی تیار نہیں ہوئی تھی۔ تھمیرہ، تائی جی کی بے چینی محسوس کر رہی تھی لیکن اس کے اندر جو تائی جی کا ڈر تھا وہ اسے ان سے بات کرنے اور وجہ جاننے سے روک رہا تھا۔ وہ خود یونیورسٹی سے آنے کے بعد اضطرابی کیفیت کا شکار تھی۔ تایا جی نے یونیورسٹی ڈراپ کرتے ہوئے اسے آگاہ کر دیا تھا کہ آج شام اسے لڑکے والے رضامندی کے ساتھ انگلی پھنانے آرہے تھے گو کہ یہ احساس ہی ہر لڑکی کے لیے خوشگوار کی غرض رکھتا ہے لیکن تھمیرہ نے اپنے لیے کچھ اور سوچا ہوا تھا اور اس میں کہیں بھی شادی کا تصور نہیں تھا۔

وہ زندگی میں بہت کچھ کرنا چاہتی تھی لیکن اسے اپنی زندگی مختصر سی محسوس ہوتی، اکثر تنہائی میں وہ سوچتی کہ اسے دنیا میں بھیجا کیوں گیا ہے اور اگر وہ آہی گئی ہے تو کچھ ایسا ضرور کرے گی کہ اس کے جانے کے بعد بھی لوگ اس کی باتیں کریں اور اچھے لفظوں میں یاد کریں۔

دن اب ڈھل رہا تھا اور وہ کچن میں اب شام کے لوازمات تیار کرنے کے ساتھ تائی جی کی پریشانی کے بارے میں بھی سوچ رہی تھی کہ اچانک تائی جی اس کے پاس آئیں۔



کے دوست کے گھر کام کرنی تھی اور اس وقت فاطر کے پاؤں دبانے کے ساتھ اپنی پیٹ کی بھوک کو لوری دے کر سنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بے خیالی .... میں اس کی نظر فاطر پر گئی اور اس نظر سے اس کی روح تک کانپ گئی تھی۔

”صاحب ہم ایسی ویسی لڑکی نہیں ہیں۔“ وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بھاگ جانا چاہتی تھی مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔

☆☆☆

فاطر کی جس وقت آنکھ کھلی اس وقت کمرے میں مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا دوست نہ جانے کہاں تھا جو اس کو جگانے نہیں آیا تھا اسے ذرا سی حیرت ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے اسے اپنے جسم کے قریب کسی اور کے وجود کا احساس ہوا تو وہ ڈر کر فوراً اٹھ کر پیچھے ہٹا تھا اور موبائل ٹارچ کے ذریعے سوچ بورڈ دیکھنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے جن آن کرتے ہی کمرے کو روشن کیا تھا اور کچھ دیر اس ساکت وجود کو دیکھنے کے بعد وہ اس کے قریب آکر اس کی سانس چیک کرنے لگا۔ لیکن وہ بے بس ذات اب اس دنیا میں نہیں تھی۔ فاطر حواس باختہ ہو گیا۔ اور سوچنے لگا کہ اب وہ کیا کرے..... اسے یقین تھا کہ اس کا دوست احسن بھی اس وقت اس کی مدد نہیں کرے گا۔ نہ جانے اس وقت وہ کہاں تھا جو ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ وہ اپنے دوست کے بارے میں سوچنے کے ساتھ سامنے پڑی اس لڑکی کی لاش کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا کہ اسے کس طرح اور کہاں ٹھکانے پر لگائے۔ اس نے پہلے گھر سے باہر نکل کر ماحول کا جائزہ لیا۔ شام ڈھل رہی تھی۔ اور ہر طرف خاموشی کا راج تھا گھر میں شاید کوئی بھی موجود نہیں تھا باہر سے پرندوں کی آتی آواز خاموشی کو توڑ رہی تھی، اس کا ذہن بہت تیزی سے چلنے لگا۔ وہ بھاگتا ہوا اوپر آیا اور پھر اس لڑکی کی لاش کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر نیچے آیا تھا۔ اسے یہ بھی خوف تھا

اولاد سمجھ کر ہی ڈانٹا، تمہیں سمجھایا، تم نے برا تو ضرور منایا ہوگا کیونکہ تم میری محبت سے ناواقف تھیں۔“

”نہیں تائی جی، میں نے ہمیشہ آپ کو اپنی ماں کی جگہ سمجھا..... اب بھی آپ جیسا کہیں گی ویسا ہی کروں گی۔“ اس کی بات پر تائی جی نے ایک بار پھر اسے گلے سے لگایا۔

تائی جی اندر ہی اندر مسکرا رہی تھیں ان کی تمام چالیں ٹھیک نشانے پر بیٹھی تھیں۔ اس وقت وہ یہ بھی بھول گئیں کہ وہ ایک معصوم کے جذبات سے کھیل رہی ہیں۔ انہیں صرف اپنے نتیجے کی خوشی عزیز تھی اور وہ جانتی تھیں کہ وہ اگر کامیاب نہیں ہوں تو یقیناً فاطر اپنی جان سے گزر جانے میں دیر نہیں کرے گا۔

تشمیرہ بانو، تائی جی کی تھوڑی سی محبت سے ہی سیراب ہو گئی تھی، وہ فوراً ہی ان کی تمام زیادتیاں کسی معصوم بچے کی طرح بھول گئی اور دل میں تاپا جی سے بات کرنے اور اس رشتے سے انکار کرنے کے لیے خود کو تیار کرنے لگی۔

☆☆☆

ایک بڑے سے کمرے میں تخت کے اوپر فاطر آرام سے لیٹ کر سگریٹ پی رہا تھا، اس کے پاؤں کے پاس بیٹھی بیس بائیس سال کی لڑکی اس کے پاؤں دبانے کے ساتھ گنتا رہی تھی، اس کی آواز میں مٹھاس ترنم اور نہ جانے کیا کچھ تھا کہ فاطر کو سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند اترنے کے ساتھ اس پر ایک عجیب سا نشہ سا چھانے لگا اس نے ذرا سی آنکھیں کھول کر اس لڑکی کو دیکھا اور ایک لمحے میں اسے لگا جیسے اس لڑکی کی جگہ تشمیرہ ہو، اسے مسکرا کر دیکھتی ہوئی، شرما کر ناخن کھرتی ہوئی، اپنے بالوں کی لٹ کو انگلی پر لپیٹتی ہوئی لیکن وہاں تشمیرہ نہیں وہ لڑکی بیٹھی تھی جو اپنے یتیم بہن، بھائیوں اور اپنی بیوہ ماں کی دواؤں کے ساتھ ان سب کے پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے یہاں فاطر



”ہمارا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔ گھر بلا کر یوں بے عزت کرنے کا شکریہ۔“ وہ لوگ رکے نہیں تھے اور نہ ہی تایاجی نے انہیں کچھ کہا تھا، ان کے عتاب کا نشانہ تو اب وہ بننے والی تھی جسے انہوں نے پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا کہ اب وہ ان کے سامنے ہی بولنے کو تیار تھی۔ جبکہ انہیں امید نہیں تھی۔

”وجہ اب میں آپ کو بتاتی ہوں۔“ تائی جی سینے پر ہاتھ باندھ کر بولیں۔

”مجھے تم سے نہیں اس سے سننا ہے، آخر کہاں مجھ سے کوئی بات ہوئی جو اس نے آج مجھے میری نظر میں دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا ہے۔“

”ہاں تو پھر پوچھیں اس سے کہ یہ ہی فاطر کو پسند کرتی ہے یا وہ بھی.....“ تائی جی تلخ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بولیں تو وہ ششدر سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ اسے شاید اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔ بے یقینی کی دیوار کے اس طرف تھم رہی تھی تو دوسری طرف تایا جی، تائی کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”کیا کہنا چاہ رہی ہو تم؟“

”یہی کہ آپ تو آفس چلے جاتے ہیں، آپ کے پیچھے یہ آپ کی بیٹی میرے معصوم بھولے بھالے بھتیجے پر ڈورے ڈالتی ہے جب ہی تو رشتے سے انکار کیا ہے اس نے۔“

”تشمیرہ کیا تمہاری تائی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ وہ منگ سی تائی جی کو دیکھنے لگی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی عورت ہے جو دو پہر میں محبت لٹا رہی تھی اور اب اس سرعام مجرم قرار دے رہی تھی۔

”یہ کیا بولے گی، اس کے پھن اس قابل ہیں جو اسے بولنے دیں۔“ وہ کہہ کر گرنے کے سے انداز میں صوفے پر بیٹھ کر رونے لگیں۔ ”ماں بن کر پالا اسے..... اس کی ہر حرکت پر پردہ ڈالتی رہی، بچی ہے مگر آج دیکھ لیا ناں.... آپ ہمیشہ مجھے الزام دیتے رہے، بے جا روک ٹوک نہیں کرتی تھی سب جانتی تھی

کہ اس کی یہ حرکت کوئی دیکھ نہ لے اس لیے یہ شکل گاڑی کی ڈکی میں لاش کو رکھ کر اس نے گردن گھما کر چاروں طرف کا جائزہ لیا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ گاڑی کا رخ شہر کی مصروف شاہراہ کی طرف کیا، اس کے بعد اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو شہر سے باہر جانے والی سڑک پر گاڑی کا رخ موڑ دیا۔ وہ جلد سے جلد اس مصیبت سے نجات چاہتا تھا۔ اس لیے شہر ختم ہونے سے پہلے وہ ایک چھوٹے سے علاقے میں داخل ہو گیا اور وہاں قبرستان کا معلوم کرنے لگا تاکہ گورن کو تھوڑی رقم کھلا کر یہ معاملہ نمٹا سکے۔ مگر شاید مصیبت نے اسے پہچان لیا تھا اس لیے وہ اب اس کا پیچھا اتنی آسانی سے چھوڑنے والی نہیں تھی۔ فاطر اب تک نہ جانے کتنی ہی لڑکیوں کی زندگیوں سے کھیل چکا تھا اور نہ جانے کس کی بددعا تھی جو اس وقت اس کے پیچھے آرہی تھی وہ اب پوری طرح مصیبت کے شکنجے میں پھنس چکا تھا۔

اس لڑکی کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے بعد اس کی کوشش تھی کہ وہ جلد سے جلد گھر پہنچ جائے لیکن دوسری طرف سے آتی گاڑی کو پہچانتے ہوئے اس کی اپنی ہی گاڑی ایک کھجے سے جا ٹکرائی اور اس کا سر اسٹیرنگ سے جا ٹکرایا اس نے ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا تھا اس کے بعد اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

☆☆☆

”تم ہوش میں تو ہو تشمیرہ۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ تایاجی نے غصے سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”جی تایاجی، مجھے اس رشتے سے انکار ہے۔“ وہ اپنی جگہ جی کھڑی نظریں پاؤں کے انگوٹھے پر جمائے مضبوط لہجے میں بولی۔

”اور انکار کی وجہ؟“

”آپ مہمانوں کا تو خیال کریں۔“ تائی جی نے سرکشی والے انداز میں کہا اور اس سے پہلے کہ تایاجی مزید کچھ کہتے گھر آئے مہمان اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

ماہنامہ پاکیزہ 156 دسمبر 2016ء



میں اس کے کروتوت..... جب ہی تو.....“  
 ”تایا جی.....“ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا۔  
 ”چلی جاؤ تشریہ یہاں سے۔“

”میری بات تو سنیں۔“ وہ منمنائی مگر دوسرے ہی لمحے تایا جی غصے سے چیخے تھے۔  
 ”چلی جاؤ تشریہ..... بیگم اس سے کہو کہ یہ چلی جائے یہاں سے۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا..... سب جھوٹ ہے۔“  
 وہ تیز آواز میں بولی مگر اس سے پہلے ہی تایا جی کا ہاتھ اس کے گال پر نشان چھوڑ گیا تھا۔ وہ آنکھوں میں آنسو لیے بے یقینی کی تصویر بنی تایا جی کو دیکھنے لگی۔  
 ”مجھے کچھ نہیں سننا اور اب چلی جاؤ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔“ تشریہ بہت آہستہ، آہستہ پیچھے ہٹنے لگی لیکن اچانک ہی فون کی بیل نے سب کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔

”بھائی صاحب کا فون تھا۔ فاطمہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، انہوں نے اسپتال کا بھی بتایا ہے آپ چلیں میرے ساتھ۔“  
 ”تائی جی بہت پریشان ہو گئی تھیں جبکہ وہ اب بھی مجرم بنی کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ تایا جی نے ایک نظر تشریہ کو دیکھا شاید انہیں اس کی.... بے گناہی کا یقین آ گیا تھا جب ہی نظریں چرا کر گھر سے نکل گئے تھے۔ پیچھے، پیچھے تایا جی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو اتارے بنے لگے۔

☆☆☆

روزی اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر تیزی سے نکلی تھی۔ سامنے گاڑی میں نوجوان اسٹیزنگ پر سر رکھے بے ہوش پڑا تھا اس کے سر سے خون ٹپک رہا تھا۔

بازوق پاکیزہ قارئین کے لیے خوشخبری

زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کو نہایت مہارت سے پراثر الفاظ کا جامہ پہناتی  
 بے شمار یادگار تحریروں کی خالق

شیریں حیدر

کی ایک اور دلکش و دلربا سلسلے وار تحریر

امرت

انشاء اللہ جلد ہی پاکیزہ صفحات کی رونق دوبالا کرنے جارہی ہے



کچھ ہی دیر میں کوئی نہ کوئی آتا ہوگا۔“  
 ”کیا تم جارہی ہو؟“ وہ روزی کو بیک اٹھاتا  
 دیکھ کر پوچھنے لگا تو وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔  
 ”پھر کب ملو گی؟“

”بہت جلد۔“ اس نے کہہ کر اپنا کارڈ فاطمہ کی  
 طرف بڑھایا تھا اور اس کے تھامتے ہی تیزی سے  
 کمرے سے نکل گئی تھی۔

رات ابھی بہت زیادہ نہیں ہوئی تھی لیکن پھر بھی  
 گھر جا کر وہ سکون کی نیند سونا چاہتی تھی کیونکہ اگلی صبح  
 اسے زوار شاہ کے آفس پہنچنا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ  
 تھکے ہوئے ذہن سے وہ کسی بھی طرح کلکت  
 کھا جائے۔

اس نے گھر آتے ہی پہلے شاور لیا پھر کھانا کھا کر  
 کمرے میں آئی اور سگریٹ جلا کر اپنے بیڈ پر آ بیٹھی  
 دوسرے ہی لمحے اس کے ذہن پر فاطمہ ابھرا تھا، وہ  
 ایک لمحے کو حیران ہوئی کہ اتنی جلدی وہ اپنی باتوں اور  
 اپنی شخصیت سے اسے متاثر کر گیا تھا اور پھر وہ اسے  
 سوچنے لگی تھی۔ ایک نیا گیم اس کے ذہن میں چلنے لگا  
 تھا، وہ یہ بھول گئی کہ صبح اس کی گاڑی سے وائیپ اعزاز  
 اغوا ہوئی ہے۔

☆☆☆

تشمیرہ کے اندر دکھ، ملال اور نہ جانے کیا کچھ  
 تھا، وہ ٹی وی لائونج میں بیٹھی بے آواز رو رہی تھی اس  
 کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وقت نے اس کے ساتھ  
 مذاق کیا ہے یا پھر اب کوئی نیا زخم لگتا باقی ہے۔ بہت  
 سال پہلے ایک گہرا زخم وقت نے اس سے اس کے  
 ماں باپ چھین کر لگایا تھا اور آج تایاجی کے سامنے  
 اس کی عزت کو دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا تھا۔ اسے  
 بہت شدت سے اپنے ماں، باپ یاد آ رہے تھے اور  
 تایاجی کے علاوہ کوئی سہارا بھی نہیں تھا۔ جس کے  
 پاس وہ اس وقت چلی جاتی اب رسوائی کے بعد بھی  
 اسے اسی گھر میں ہی رہنا تھا۔

روزی نے پہلے ادھر ادھر دطلب نظروں سے دیکھا مگر  
 کسی کو نہ پا کر اس نے ایسوی لینس کو فون کیا تھا اور جب  
 تک ایسوی لینس نہیں آگئی تھی وہ وہیں اس کے پاس  
 کھڑی رہی پھر ایسوی لینس کے ساتھ وہ اس بے ہوش  
 نوجوان کو لے کر اسپتال آئی تھی۔ نہ جانے کیا تھا اس  
 شخص میں جو روزی کو کھینچ کر اپنے ساتھ لے آیا تھا  
 کیونکہ وہ ان چکروں میں پڑنے والی ہرگز نہیں تھی۔ وہ  
 خود اندر ہی اندر جھنجھلا بھی رہی تھی لیکن اس کے باوجود  
 وہ اس وقت تک وہاں رہی جب تک اسے ہوش  
 نہیں آگیا۔

”کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ اسے ہوش میں آتا  
 دیکھ کر وہ اس کے قریب آئی تھی۔ ”لینے رہو، بیٹھنے کی  
 ضرورت نہیں ہے۔“ وہ اسے واپس لٹاتے ہوئے  
 بولی۔

”میں کہاں ہوں اور تم کون ہو؟“  
 ”میں روزی ہوں اور تم اسپتال میں ہو  
 تمہارا.....“ اس نے قصداً بات ادھوری چھوڑ دی اور  
 کھوجتی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔  
 ”ہاں، مجھے یاد ہے۔“  
 ”شکر ہے، ورنہ میں بھی.....“

”یہی کہ میں سب کچھ بھول گیا ہوں۔“ وہ اس  
 کی بات کاٹ کر فوراً بولا تو وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔  
 ”میرا نام فاطمہ ہے اور میں بہت شاطر دماغ کا  
 مالک ہوں اتنی آسانی سے بھولنے والا نہیں۔“  
 ”گڈ.....؟ خوشی ہوئی تم سے مل کر۔“  
 ”یقین نہیں آتا۔“ وہ جال پھینک رہا تھا اور  
 روزی سمجھ کر انجان بن گئی۔

”اپنے گھر میں کس کو بتانا چاہو گے تم یہاں ہو؟“  
 ”کیوں، جان چھڑانا چاہتی ہو؟“  
 ”نہیں گھر تک آنا چاہتی ہوں۔“ وہ بے ساختہ  
 بولی تو وہ مسکرا کر رہ گیا۔ ”ویسے میں نے تمہارے  
 موبائل سے تمہارے والد صاحب کو اطلاع کر دی تھی

ماہنامہ پاکیزہ 158 اگست 2016ء



بھی نہیں کیونکہ ان دونوں میں جواب دینے کی سکت ہی نہیں تھی اور پھر لوگوں کو کیا بتاتے کہ انہوں نے ہی در، در کی ٹھوکر کھانے کے لیے گھر سے نکال دیا ہے زبان پر تالے ڈالے وہ لوگ یونہی چلتے ہوئے محلے سے نکل کر سڑک پر آ گئے تھے۔

دودن تھے ریہال کے پاس اس کے بعد تو اسے جرمنی چلے جانا تھا لیکن پہلے تو امی کو اکیلے گھر میں چھوڑ کر جانے کے لیے پریشان تھا اور اب سڑک پر چلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا اب کیا کروں اس صورت حال میں امی کو کس رشتے دار کے یہاں ٹھہراؤں۔

”رشتے دار، ہونہہ.....“ اس نے نخوت سے سر جھٹکا۔ ”دنیا ایسی ہی ہے ظالم..... مظلوم کو مزا دے کر طاقت ور ہمیشہ فتح پاتا ہے۔“ وہ سوچنے لگا۔ ”لیکن اگر میں اس وقت کمزور ہوں تو آنے والے وقت میں ان سے کہیں زیادہ طاقت ور بن کر سامنے آؤں گا۔“ وہ اس وقت خود کو ہمت دلانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

امی کے اوپر تو ایک بڑا سانحہ اتر اٹھا۔ ان سے ان کے مرحوم شوہر کی آخری نشانی چھین لی گئی، دل میں دکھ کے ساتھ تکلیف بھی اٹھ رہی تھی، آنکھوں سے آنسو سیلاب کی صورت میں جاری تھے ایسے میں انہیں اندازہ ہی نہیں ہوا کہ وہ کہاں چل رہی تھیں۔ اچانک گاڑی کے بریک چرچانے سے ریہال چونکا تھا۔

”امی.....“ وہ چیخ کر ان کی طرف بڑھا تھا۔ وہ اسی گاڑی کے سامنے بے ہوش پڑی تھیں ان کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

☆☆☆

”مجھے یہ سب کچھ سن کر بہت افسوس ہوا۔“ اعزاز شاہ، ریہال سے کہہ رہے تھے۔ ”میں چاہوں تو ابھی کے ابھی وہ گھر خالی کر داسکتا ہوں مگر یہ ٹھیک نہیں ہے کیونکہ تم بھی جرمنی جا رہے ہو اور پھر امی کے پاس

تائی جی نے کس طرح چالاکی سے اسے اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر اپنا ٹھیکل کھیلا تھا۔ اسے اب سمجھ میں آ رہا تھا لیکن اس کے بعد ان کا کیا ارادہ تھا، یہ وہ جاننے سے قاصر تھی۔ اس کا دل چاہا کہ ریہال کو یہ ساری صورت حال بتائے لیکن پھر کچھ سوچ کر رہ گئی۔ اور پھر یہ دکھ تو اس کی اپنی ذات کے لیے تھے کوئی سوائے تسلی دینے کے اور کیا کر سکتا تھا؟ وہ اس وقت سسک رہی تھی مگر اس کے آنسو صاف کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ جبکہ تائی جی کو فاطر کے ایکسیڈنٹ نے بھی اپنے گناہ کا احساس نہیں دلایا تھا اگر دلوں پر قفل لگے ہوں تو پھر انسان کو کسی چیز کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ اور یہ ہی حال تائی جی کا تھا انہوں نے اس، مظلوم پر الزام لگاتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ خدا کی لاشی بے آواز ہے وہ کسی بھی وقت ان پر پڑ سکتی ہے۔

☆☆☆

خالہ نمنب نے کوئی بہت زیادہ احسان نہیں کیا پس انہیں شام تک کا ہی وقت دیا تھا جسے ریہال اور امی نے غنیمت جان کر کچھ ضروری چیزیں ہی اپنے پاس رکھی تھیں۔ اس کے بعد جب گھر سے نکلنے لگے تو جہاں ان کی آنکھیں بھرا آئیں وہیں ریہال کو بھی اس گھر میں بچپن سے لے کر اب تک گزرنے والا ایک، ایک بل یاد آنے لگا۔

”آپ فکر نہ کریں امی، ہم بہت جلد اپنے گھر میں واپس آئیں گے۔“ اس نے ماں کو گلے لگا کر عزم سے کہا تو وہ شدت سے رونے لگیں۔

”نہ جانے کس بات کا بدلہ لیا ہے نمنب نے اور کیا ملا اسے ہمیں بے گھر کر کے۔“

”بس امی چپ کر جائیں، آپ دیکھیے گا میں کس طرح یہ گھر ان سے لیتا ہوں۔“ وہ کہہ کر انہیں اپنے ساتھ لگائے ہوئے گھر سے نکل گیا تھا۔ محلے کے ہر شخص نے تاسف سے انہیں دیکھا تھا کسی نے روک کر پوچھا



ملتا تھا اور نہ وہ ملی تو بالآخر تھک ہار کر اس کے موبائل پر ایک بار پھر کال کرنے لگا۔

”ہیلو.....“ دوسری طرف اس کی کمزوری آواز سنائی دی تو وہ ٹھٹھکا تھا۔

”کیا ہوا، تم ٹھیک تو ہو؟“

”نہیں..... بس طبیعت ذرا خراب ہے۔“

’اوئے کیا ہوا..... ڈاکٹر کو دکھایا؟‘ اس کے لہجے میں بے قراری تھی اور وہ سمجھی نہیں یا سمجھ کر تلخ ہوئی تھی۔

”دکھا دوں گی۔“ اس نے بیزاری سے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ اور وہ اپنی جگہ حیران کھڑا اس کے انداز کو سوچنے لگا تھا۔

☆☆☆

”جی مس تانیہ.....!“ زوار شاہ نے روزی کو بغور دیکھتے ہوئے کہا تو وہ آنکھوں پر لگے سن شیزا تار کران کو ٹیبل کی سطح پر رکھ کر سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”آپ کی سی دی میں ہے کہ آپ اس سے پہلے دو کمینیز میں مختلف نوعیت کی جاب کر چکی ہیں۔ وہاں سے چھوڑنے کی وجہ؟“

”بہتر سے بہتر کی جانب جانے کے لیے انسان کو کوشش کرنی پڑتی ہے۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ کل اگر آپ کو یہاں سے بہتر کوئی اور آفر آگئی تو آپ وہاں چلی جائیں گی؟“

”کیوں، کیا آپ کا ادارہ بہتر سے اور مزید بہتر کی طرف نہیں جائے گا۔“ وہ اس کی بات پر مسکرا کر رہ گئے۔ فوراً کوئی بات نہیں بن پڑی تو انٹر کام اٹھا کر چائے کا آرڈر دیا پھر ایک بار اس کی طرف متوجہ ہوئے ایسا کچھ خاص ضرور تھا اس میں کہ جس کی انہیں ہمیشہ سے تلاش رہی تھی۔ اس کے لہجے میں بلا کی خود اعتمادی تھی اس کی شخصیت کا سحر مخاطب کو اپنے جال میں مکمل جکڑ سکتا تھا۔ یہی چیز ان کو متاثر کر گئی تھی۔

روزی نے بھی ان کے بارے میں ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی اس آفس میں قدم

کسی نہ کسی کو تو ہونا چاہیے۔“ وہ مسکرائے تو ریال چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔

”ارے یار پریشان کیوں ہوتے ہو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو بلا بھجک کہہ دینا۔“ ریال انہیں باہر دروازے تک چھوڑنے آیا تو وہ مزید کہنے لگے۔

”امی کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔ میں ایک بیٹے کی طرح ان کا خیال رکھوں گا۔“ وہ کہہ کر چلے گئے تو ریال سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد اب اس کے لیے آسانیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ سب سے زیادہ فکر اسے ماں ہی کی تھی اور اسے اعزاز شاہ جیسے دوست مل گئے تھے جو اس کی ماں کی مکمل ذمہ داری اپنے سر لے چکے تھے۔ وہ اندر کمرے میں آیا تو امی ابھی سو رہی تھیں۔ وہ انہیں چادر اوڑھا کر ٹی وی لائونج میں آگیا تھا اور ٹی وی کے چینل سرچ کرنے لگا لیکن اچانک ہی ذہنی سوچ بہک کر تشمیرہ کی طرف چلی گئی۔ ایک لمحے میں جیسے سارا منظر ہی بدل گیا تھا۔ وہ اپنے پرانے گھر پہنچ گیا تھا اور وہاں اسے اپنے آس پاس تشمیرہ کی آواز اس کی باتیں اس کی ہنسی کے جلت رنگ سنائی دینے لگے تھے۔

دل ایسے خواب دیکھ رہا تھا اور ذہن ان خوابوں کو حقیقت کا رنگ دینے پر اکسارہا تھا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ جرمی جانے سے پہلے تشمیرہ کو اپنی محبت سے آگاہ ضرور کرے گا اور پھر کچھ سوچ کر اس نے اس کے موبائل نمبر ڈائل کیے تھے لیکن اس نے کال ریسیو نہیں کی تو وہ گھڑی میں ٹائم دیکھ کر ٹھٹھکا تھا۔

”رات اتنی گزر گئی اور مجھے پتا ہی نہیں چلا۔“ اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر وہ یہ فیصلہ کر کے سویا تھا کہ صبح ہی تشمیرہ سے بات کرے گا۔

اگلی صبح اس نے پہلے امی کو اپنے ساتھ بٹھا کر ناشتا کروایا پھر دوائیں کھلا کر وہ یونیورسٹی کے لیے نکل گیا تھا، اسے تشمیرہ سے ملنے کی جلدی تھی۔ اس لیے یونیورسٹی پہنچ کر اسے ہی تلاش کر رہا تھا لیکن اس نے نہ

ماہنامہ پاکیزہ 160 دسمبر 2016ء



پرس میں سے موبائل نکالا اور فون نمبر دیکھ کر پہلے کچھ سوچا پھر کال ریسیو کر کے خاموش رہی۔

”میں روزی سے بات کر سکتا ہوں؟“ دوسری طرف فاطمہ تھا اور وہ پہچان کر بھی انجان بن گئی۔

”بات کر رہی ہوں آپ کون؟“

”مجھ ناچیز کو فاطمہ کہتے ہیں، پہچان تو گئی ہوں گی

آپ؟“ اس نے اپنی بات کی تصدیق چاہی تو وہ کھلکھلا کر ہنسنے ہوئے بولی۔

”بالکل، کیسے فون کیا؟“

”ملنا چاہتا ہوں۔“

”ابھی کل ہی تو ہم ملے تھے پھر اتنی جلدی.....؟“

”پریت بڑھانے کے لیے ملاقات ضروری ہوتی ہے۔“

”ہاں لیکن اتنی جلدی نہیں.....“ اس کا انداز ٹالنے والا تھا لیکن وہ بھی ضد پر اتر آیا۔

”لیکن میں چاہتا ہوں اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم انکار نہیں کرو۔“

”اچھا لیکن مجھے سوچنے کا وقت دو۔“

”سوچنا کیا ہے؟“ وہ بے صبری سے بولا۔

”یہی کہ تم سے مل کر مجھے کیا فائدہ ہوگا؟“

”لاکھوں کا بزنس ہے میرا عیش کرو گی.....“ اس نے لالچ دی اور وہ ہنسی تھی۔

”تمہارے لاکھوں سے کہیں زیادہ ہے میرے پاس.....“

”چلو دونوں مل جاتے ہیں، آگے کی زندگی آرام سے گزر جائے گی۔“ فاطمہ مذاق کرنے لگا اس لیے فوراً بولا۔

”اسی لیے کہہ رہی ہوں سوچنے کا وقت دو.....“ اس نے کہنے کے ساتھ سلسلہ منقطع کر دیا تھا

اور اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگی تھی کہ اس سے کیا کام نکلوا یا جاسکتا ہے گو کہ ابھی وہ اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی اور اس کی باتوں

نے گھر میں جیسے ہی قدم رکھا موبائل بجنے لگا تھا اس نے

رکھا تھا جیسی خود کو ان کی سوچ کے سانچے میں ڈھال کر ان سے ہر موضوع پر بات کر رہی تھی۔ وہ یہ تو جان گئی تھی کہ اس جاب کے لیے وہ سلیکٹ ہو چکی ہے لیکن وہ

پھر بھی زوار شاہ سے سننا چاہتی تھی ابھی وہ باتوں میں مصروف تھے کہ اچانک اعزاز شاہ دستک دینے کے بعد

اجازت ملتے ہی اندر داخل ہوئے۔

”بابا وانیہ.....“ وانیہ کا نام سن کر روزی ایک لمحے کو ہنسنی لگی اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گیا جسے

شاید ہی کسی نے محسوس کیا ہو، وہ فوراً سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”کڈ میچر کا پھر فون آیا؟“ زوار شاہ نے پوچھا۔

”نہیں.....“

”تو بس پھر بے فکر رہو، وہ آج شام گھر آ جائے گی اور اس کی فکر کرنا چھوڑ دو جب اسے تمہاری فکر نہیں

ہے۔“ وہ کچھ نہیں بولے اور واپس جانے لگے تو زوار شاہ نے پکارا۔

”اعزاز.....“ ان سے ملو یہ ہیں وانیہ..... ہماری نئی ایڈیٹر اور مس وانیہ، یہ میرا بیٹا اعزاز.....“ اس نے

ذرا سا مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”میں چلوں سر.....“

”ٹھیک ہے کل آپ کو آپ کا اپائنٹمنٹ لیٹر مل جائے گا۔“

”شکریہ.....“ وہ مسکرا کر باہر نکل گئی تھی اور دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ اب اس کی منزل دور نہیں

ہے۔ اس نے اپنے گھر سے یہاں تک کا سفر بس میں کیا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی بھی طرح کا کوئی شک

زوار شاہ کو ہو اور پھر گھر سے تھوڑے فاصلے پر اتر کر اس نے پہلے یہ یقین کر لینا مناسب سمجھا کہ کہیں کوئی اس کا

پیچھا تو نہیں کر رہا گو کہ وہ کوئی قتل کرنے کی غرض سے نہیں گئی تھی اور نہ ہی کوئی غلط کام سرانجام دے کر آرہی

تھی لیکن محتاط رہنا اس کے لیے بہت ضروری تھا۔ اس نے گھر میں جیسے ہی قدم رکھا موبائل بجنے لگا تھا اس نے



روح تک گمائل ہو جاتی۔ اس وقت بھی وہ ان کی باتوں سے بچ کر ہی یہاں آ کر بیٹھ گئی تھی۔

”کیوں می، پاپا آپ لوگ مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے؟“ اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ”آپ لوگوں نے سوچا نہیں کہ آپ کے بعد میرا کیا ہوگا۔“ وہ گھٹنوں میں سر رکھ کر سسکنے لگی کہ اچانک ہی اس طرف تایا جی آئے تھے اور اسے یوں سسکتا دیکھ کر اپنی جگہ جم کر رہ گئے تھے۔ بیوی کے جھوٹ کے قصے سے وہ اسی دن واقف ہو گئے تھے لیکن بولے مصلحتا نہیں تھے۔ لیکن بیٹی کو اب سڑھیوں پر بیٹھے دیکھ کر ان کا خون جوش مار رہا تھا، دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بٹینچے وہ وہاں سے چلے گئے تھے۔

”ارے تم یہاں بیٹھی ہو؟“ فاطمی کی آواز پر اس نے جلدی سے سر اٹھا کر تھیلیوں سے چہرہ رگڑتے اسے دیکھا جو... کچھ فاصلے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”کوئی کام تھا؟“

”ہاں.....“

”کیا کام ہے؟“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ دواسٹپ پھلانگ کر اس کے برابر آ کر کھڑا ہوا۔

”بہت پور ہو رہا ہوں، چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔“

”کیوں.....؟“ میرا موڈ نہیں۔“ وہ کہہ کر جانا چاہتی تھی کہ اچانک ہی فاطمہ نے اس کے دوپٹے کا کونا پکڑ لیا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“

”یہ محبت ہے۔“

”بھاڑ میں گئی ایسی محبت.....“ اس نے کہہ کر اپنا دوپٹا کھینچا اور تیزی سے اندر کی طرف بڑھی۔ لاؤنج میں ہی تایا اور تائی جی کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کو رکی تھی دوسرے ہی لمحے فاطمہ بھی اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

”دیکھ لیں جس کے لیے آپ مجھے برا بھلا کہہ رہے ہیں، وہ آپ کی ناک کے نیچے ہی محبت کی پتلیں لٹا رہی ہے۔“ تائی جی نے طنز یہ انداز میں کہا تو وہ

سے بھی وہ صرف اتنا اخذ کر پائی تھی کہ وہ صرف عاشق مزاج ہے لیکن وہ اپنی اس عادت کی بدولت کس حد تک جاسکتا ہے اس کا اندازہ اسے نہیں تھا اور پھر اسے اب دانیہ کی بھی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی جو وہ اس کے لیے اس کو پالتی۔ دانیہ سے وہ خود بھی جان چھڑانا چاہتی تھی مگر اس کے اغوا ہونے میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا اور کس کا ہاتھ تھا، یہ جاننے سے وہ قاصر تھی لیکن چاہتی ضرور تھی کہ وہ واپس اپنے گھر پہنچ جائے اور جب سے اسے دانیہ کے جوان بچوں کا علم ہوا تھا تو اس سے وہ اپنی لاعلمی اور اس کے شاطر پن پر حیران رہ گئی تھی اور اب دانیہ جیسا ہی ایک شخص اس کے پیچھے تھا۔ جس سے وہ اپنے من چاہے کام بڑے آرام سے کرا سکتی تھی۔ روزی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی اپنے ایک خاص آدمی گل خان کو فون ملا رہی تھی کیونکہ کسی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے وہ اسے ہی استعمال کرتی تھی۔

☆☆☆

موسم نے اچانک ہی انگڑائی لی تھی اور ہوا میں خنکی شامل کرتے ہوئے اسے قدرے سرد بھی کر دیا تھا یعنی ابھی سردیاں پوری طرح نہیں آئی تھیں۔ بس شامیں کچھ ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔ شمرہ پیچھے لان سے اوپر چھت پر جاتی سیڑھیوں پر بیٹھی، آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھ رہی تھی جو اپنی بولیوں میں ایک دوسرے کو الوداع کہتے اپنے گھونسلوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دل میں ایک کک سی اٹھی اور آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ بچھلے کئی دنوں سے اسے اپنے می، پاپا بہت شدت سے یاد آ رہے تھے اور جب سے تائی جی نے اس پر الزام لگایا تھا اس نے یونیورسٹی بھی جانا چھوڑ دیا تھا اور ادھر تایا جی نے بھی خاموشی اختیار کر لی تھی۔ جبکہ تائی جی شوہر کے سامنے تو کچھ نہیں کہتی تھیں لیکن اکیلے میں ایسے الفاظ ضرور استعمال کرتی جسے سن کر اس کی



کرنے کو لیکن پھر فوراً ہی وہ خود پر جبر کرتی رخ موڑ گئی تھی۔ یہ بات وہ جانتی تھی کہ وہ جرمی جا رہا ہے اور کوئی دو تین ماہ کے لیے نہیں بلکہ پورے تین سال کے لیے وہ اسے دیکھے اور ملے بغیر رہے گی، اگر گھر میں ایسے حالات نہ ہوتے تو شاید وہ اس سے مل کر اسے خوشی سے رخصت کرتی مگر اب وہ مجبور تھی، اس لیے خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

☆☆☆

انسانی دل محسوسات کے معاملے میں بہت کمزور ہوتا ہے جب یہ کسی پر آ جائے تو پھر ضد، ہٹ دھرمی غصہ اور حسدیت سب کے تمام ہی ریکارڈ توڑ دیتا ہے، وہ یہ نہیں سوچتا کہ بدلے میں محبت ملے گی یا نہیں، بس اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھ کر زندگی اور موت کی بازی سمجھ کر کھیلنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ خوش ہے تو دل مطمئن ورنہ ہر اندیشے اسے اپنی گرفت میں لیے رکھتے ہیں اور یہ ہی حال اس وقت رہا تھا۔ امی کی طرف سے ہر طرح سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد وہ تھمرہ کے لیے فکر مند تھا جو پچھلے کئی دنوں سے یونیورسٹی سے بھی غیر حاضر ہونے کے ساتھ اس کی فون کال بھی اٹینڈ نہیں کر رہی تھی اور یہ بات اس کے لیے تشویش کا باعث بن رہی تھی۔

”کیا بات ہے بیٹا، کچھ پریشان لگ رہے ہو؟“ امی نے میز پر کھانے کے برتن رکھتے ہوئے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر پوچھا تو وہ چونک کر ذرا سا مسکرایا۔

”میں سوچ رہا تھا کہ اللہ نے کس طرح آپ کو تحفظ بخشا ہے۔“ اس نے فوراً بات ہٹائی۔ ”کتنے ٹیک آدمی ہیں اعزاز شاہ کوئی غرض نہیں انہیں ہم سے لیکن پھر بھی انہوں نے ہماری مدد کی۔“

”ہاں ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے تو دنیا قائم ہے۔“ امی اس کی پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے بولیں۔ ”ورنہ اپنے تو پیر کی چل بھی کھینچ لیتے ہیں، اپنی

نا سبھی کے عالم میں پہلے تایا جی کو پھر اپنے پیچھے قاطر کو دیکھ کر ساری بات سمجھ گئی۔

”یہ غلط ہے..... جو آپ سوچ رہے ہیں۔“ وہ کسی طرح بول پڑی۔

”ہاں، محبت جرم نہیں ہے۔“ قاطر اس کی بات کاٹ کر فوراً بولا اور اس کے سائڈ سے نکل کر تایا جی کے سامنے جا کھڑا ہوا جبکہ وہ اپنی جگہ سن ہو گئی تھی۔

”ہم دونوں اگر ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں تو اس میں غلط کیا ہے؟“

”جھوٹ بول رہا ہے یہ۔“ وہ غصے سے چیخا چاہتی تھی لیکن آنسوؤں میں آواز رندھ گئی تھی۔

”لیکن ابھی باہر تم مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ تم خود تایا جی سے بات کرو گی۔ دیکھو تھمرہ ڈرو نہیں، میں ہوں تمہارے ساتھ۔“

”تم اپنے باپ کو بلاؤ۔“ تایا جی کی آواز اسے کسی ہم سے کم نہیں لگی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر تایا جی کے غصے سے لال ہوتے چہرے کو دیکھا پھر بہت آہستہ، آہستہ پیچھے ہٹی اور کچھ فاصلے پر آ کر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے کسی اور کے تاثرات دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی جبکہ تایا جی اور قاطر اس کے پیچھے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھنے کے ساتھ آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی کامیابی کی مبارک باد دے رہے تھے جبکہ تایا جی نے بہت کچھ دیکھنے کے ساتھ بہت کچھ سوچ بھی لیا تھا۔

تھمرہ کراہند کر کے اپنی قسمت پر رورہی تھی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر تایا جی اس سے کس بات کا بدلہ لے رہی ہیں، نہ جانے کون خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں جو ذرا سی بات پر منوں مٹی تلے جا سوتے ہیں جبکہ اسے تو ہلکا سا بخار بھی نہیں ہوا تھا اور... وقت اسے رسوا کرنے کے درپے تھا۔ اچانک اس کا موبائل فون بجنے لگا تو اس نے ذرا سا سر اٹھا کر اسکرین پر چمکتا ریپال کا نام دیکھا۔ اس کا دل مچلا تھا اس سے بات



نہیں دوں گا۔“ وہ مسکرائے تو امی نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ڈھیروں دعائیں دی تھیں۔ ایک لمحے کو ان کی آنکھیں نم ہوئیں، کتنا عرصہ ہو گیا تھا انہوں نے اپنی ماں کی دعائیں نہیں سمیٹی تھیں ورنہ شادی سے پہلے وہ ہر رات ان کے پاؤں دبانے کے ساتھ ڈھیروں دعائیں وصول کرتے تھے لیکن اب نہ جانے کیوں دوریاں آگئی تھیں۔

☆☆☆

اعزاز شاہ نے گھر کے گیراج میں گاڑی کھڑی کی اور اتر کر لان کی گھاس کو اپنے پیروں تلے روند کر لاؤنج میں داخل ہوئے جہاں ہر سو خاموشی چھائی ہوئی تھی یوں لگتا تھا جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہیں ہو، ہر کوئی اپنے کمرے میں بند نہ جانے کیا کر رہا ہوتا تھا۔ کبھی، کبھی ان کا دل چاہتا کہ وہ اس خاموشی میں اپنی آواز، غصے و دکھ کی آمیزش کے ساتھ شامل کرے، اور گھر کے در و دیوار ہلا دیں مگر یہ خواہش ان کے اندر تھوڑی دیر بعد دم توڑ جاتی تھی۔ اس وقت وہ ریمال اور ماں جی کے کمرے سے واپس آئے تھے اور حیران تھے کہ ان دو افراد کے بیچ زندگی کس طرح مسکرا رہی تھی انہیں اپنی بیٹی کا خیال آیا جسے انہوں نے پڑھنے کے لیے لندن بھیجا تھا۔ انہوں نے پینٹ کی جیب سے موبائل نکالا اور بیٹی کو فون ملانے لگے۔ مگر وہ نہ جانے کہاں مصروف تھی جو ان کا فون ریسپونڈ نہیں کیا۔ وہ سر جھٹک کر کمرے کی طرف بڑھنے لگے کہ اچانک باپ کے کمرے سے آتی آواز پر ان کے قدم رک گئے۔

”وانیہ اغوا ہو گئی ہے۔“

”کیا؟“ روائیکم نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔

”کب..... کیسے؟“

”کل.....“

”اور آپ مجھے اب بتا رہے ہیں۔“

”پہلے بتاتا تو کیا کر لیتیں؟“

خالہ کو بتی دیکھ لو۔“ وہ اسی دکھ و تاسف سے بولیں تو اس کا منہ میں جاتا نوالہ ذرا فاصلے پر ہی رک گیا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا، میں جب واپس آؤں گا تو پھر ہم اپنے گھر کے لیے ضرور کچھ کریں گے۔“

”تمہاری واپسی تک کیا میں اسی گھر میں رہوں گی؟“

”کیوں، کیا ہے اس گھر میں؟“ اعزاز شاہ ڈانٹنگ ہال میں داخل ہوتے ہوئے امی کی بات سن کر فوراً بولے تو وہ دونوں ان کی اچانک آمد پر حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگے۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو دوست..... ماں کے ہاتھ کے پکے کھانے کی خوشبو نے کھینچ لیا۔“

”آپ تو شرمندہ کر رہے ہیں۔“ ریمال مسکرا کر بولا۔ امی، اعزاز کے سامنے پلیٹ رکھ کر اس میں سالن ڈالنے لگیں۔

”صرف کھانا ہی نہیں، ماں جی اس کے بعد آپ کے ہاتھ کی بنی چائے بھی پیوں گا۔“ ان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ برسوں سے امی اور ریمال کو جانتے ہوں، اس لیے انہیں بھی اعزاز شاہ سے اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس رات وہ کافی دیر ان لوگوں کے ساتھ رہے اور ہر موضوع پر ریمال سے بات کرنے کے ساتھ اسے تھوڑا بہت اپنے بارے میں بتا کر اٹھ گئے۔

”اب چلتا ہوں دوست پھر آؤں گا۔“

”لیکن مجھ سے ملاقات تو اب تین سال بعد ہی ہوگی۔“

”تو کیا ماں جی یہاں نہیں ہوں گی۔“ وہ فوراً خفگی سے بولے۔ ”میں ان سے ملنے آؤں گا۔“

”ہاں ضرور بیٹا۔“ امی نے فوراً کہا۔ ”تمہیں دیکھ کر تو مجھے یوں لگے گا جیسے میرا ریمال میرے سامنے ہو۔“

”اور میں بھی آپ کو اس کی کمی محسوس ہونے

ماہنامہ پاکیزہ 164 دسمبر 2016ء



## ہم معصوم ہیں

نئے بچوں کو شہادت پر بھی معصوم ہیں  
وحشیوں کو رحم نہ آیا کہ وہ معصوم ہیں  
زخم تازہ ہیں ابھی تک میرے پاکستان کے  
کتنے نذرانے دیے تھے سب نے اپنی جان کے  
ماؤں نے بھیجا تھا بچوں کو بڑے ہی شوق سے  
اتحاش میں تھے مگر سارے ہی بچے ذوق سے  
گھس گئے وحشی درندے بچوں کے اسکول میں  
بھر دیا تھا پھول چروں کو لہو اور دھول سے  
سرخ ہو کر رہ گئیں خوں سے سبھی کی وردیاں  
جو پہن کر آئے تھے بے داغ ساری جریاں  
نئے، نئے پھولوں پر ان کو ترس آیا نہیں  
ظالموں کو ان کا کھلنا جانے کیوں ہمایا نہیں  
ماتیں نہیں اپنوں کی لاشوں پہ ہیں ماتم کناں  
ظالموں نے کر دیے ویران ان کے سب جہاں  
اک جہاں اس سانچے پہ ہوا لوح خواں  
روتے، روتے تھک گئے ہیں یہ زمین و آسمان

☆☆☆

## دسمبر لوٹ آیا ہے

اسے کہنا دسمبر لوٹ آیا ہے  
ہوائیں سرد ہیں  
اورادیاں بھی دھند میں گم ہیں  
پہاڑوں نے برف کی شال  
پھر سے اوڑھ رکھی ہے  
وہ سبھی رہتے تمہاری یاد میں پُرم سے لگتے ہیں  
جنہیں شرفِ مسافت تھا  
وہ سارے کارڈز، وہ پرفیوم  
وہ چھوٹی سی ڈائری  
وہ چائے جو ہم نے ساتھ میں پی تھی  
تمہاری یاد دلاتی ہے  
تمہیں واپس بلاتی ہے  
دیکھو یوں نہ ستاؤ ناں  
دسمبر لوٹ آیا ہے  
تم بھی لوٹ آؤ ناں.....

مرسلہ: عجمیہ ضیاء بخش، کراچی

”تو اس کی ماں کو یہاں آنے سے روک دیجی۔“  
زوار شاہ بیگم کی بات سن کر کچھ دیر کے لیے خاموش  
ہو گئے۔

”آنے دو اس بار میں خود بات کروں گا۔“ اب  
ان کے لہجے میں غصے کے ساتھ نہ جانے کیا تھا کہ اعزاز  
شاہ سر جھٹک کر اپنے کمرے میں آ گئے۔ کمرے میں ہر  
چیز ویسی ہی تھی جیسی وہ صبح چھوڑ کر گئے تھے بیڈ شیٹ  
ایسے مسلی ہوئی تھی جیسے وہ ابھی سو کر اٹھے ہوں، ایک  
سائڈ پر گیلیاں تو لیا پڑا تھا۔ پچھلی رات جو انہوں نے  
سگریٹ پی تھیں اس کے باقی ماندہ ٹکڑے اور راکھ بھی  
ابھی تک ایش ٹرے میں اور اس کے آس پاس گری  
ہوئی تھی۔ کمرے میں بھی عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی انہیں  
اپنے کمرے سے وحشت ہونے لگی اور وہ واپس باہر  
نکلے تو ماں کو دیکھ کر ٹھٹک کر اپنی جگہ رک گئے نظریں خود  
خود جھک گئیں۔

”کیا بات ہے؟“ وہ انہیں دیکھ کر بولیں۔

”کچھ نہیں.....“

”پھر کہیں جا رہے ہو؟“

”نہیں.....“

”ٹھیک ہے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں  
ہے، شہر کے حالات خراب ہو گئے ہیں۔“

”اور اس گھر کے.....“ نہ چاہتے ہوئے بھی  
ایک تلخ جملہ ان کی زبان سے پھسل گیا اور ردا بیگم نے  
ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر تاسف سے مسکرا دیں۔

”جہاں میری غلطی نہیں وہاں بھی میں مجرم  
نہی۔“

”غلطی آپ کی ہے، یہ الگ بات ہے کہ آپ  
مانتی نہیں۔“ وہ کہہ کر رے نہیں جا کر کمرے میں بند  
ہو گئے جبکہ ردا بیگم کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ اور یہ کوئی  
پہلی بار تو نہیں ہوا تھا پہلی بار تو صرف انہوں نے زبان  
کھولی تھی ورنہ ہر بار تو وہ اپنے انداز سے ان کی روح  
تک کو اذیت دیتے آئے تھے۔ ماں تھیں اس لیے ان کے



بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اندر کا دکھ وہ بخوبی جانتی تھیں مگر ان کے لیے صرف دعا ہی کر سکتی تھیں۔

”بیٹا میں سب حقیقت جانتا ہوں لیکن پھر بھی یہ غلطی سرزد کرنے جا رہا ہوں صرف اس لیے کہ اس عمر میں کوئی بدنامی اپنے سر لینا نہیں چاہتا اور تم تو اپنی تائی جی کو جانتی ہو جہاں انہوں نے تمہاری پاک دامن پر کچڑا اچھالنے میں دریغ نہیں کی وہاں وہ کوئی اور بات بھی منسوب کر سکتی ہیں اسی لیے شاید اللہ نے مجھے....

بے اولاد رکھا۔“ وہ دروازے سے سر نکائے کہہ رہے تھے۔ تشمیرہ نے تڑپ کر دروازہ کھولا اور ان کے سینے سے جا لگی۔

”میں ہوں آپ کی اولاد، آپ کا جو بھی فیصلہ ہے مجھے منظور ہے بس آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں۔“

تشمیرہ سے خون کا رشتہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسے بچپن سے پالا تھا اس لیے اس کے دکھ پر تایا جی کی اپنی آنکھیں بھر آتی تھیں اور پھر مرحوم بھائی کی یادیں اس معصوم کے ساتھ وابستہ تھیں۔ تایا جی کا دل بے ساختہ بھر آیا تھا۔ بیوی کی حرکتوں کو وہ بردوں سے جانتے ہوئے بھی نظر انداز کرتے آرہے تھے۔ یہ ان کی شرافت تھی کہ انہوں نے کبھی بیوی کو کچھ نہیں کہا تھا کیونکہ ان کے خیال میں اس طرح تشمیرہ بھی ان کی عزت کرنا چھوڑ دے گی جبکہ ایسا نہیں تھا، اسے تو خدا نے کسی اور ہی مٹی سے بنایا تھا جو ہمیشہ ہی ہر بات پر سر خم کرتی آئی تھی اب بھی بس آنسو ہی بہا رہی تھی۔

”تم نے یونیورسٹی جانا کیوں چھوڑ دیا؟“ تایا جی اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے اس کے بیڈ پر آکر بیٹھ گئے۔ ”تمہیں بہت شوق تھا ناں جرنلسٹ بننے کا پھر؟“

”کچھ نہیں..... بس ویسے ہی دل نہیں چاہ رہا تھا۔“ وہ نظریں چرا گئی۔

”کل سے اپنی پڑھائی شروع کرو..... میں خود تمہیں یونیورسٹی چھوڑنے جاؤں گا۔“ وہ اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب سو جاؤ، صبح ناشتے کی ٹیبل پر ملاقات ہوگی۔“ وہ کہہ کر کمرے سے

اعزاز شاہ نے کمرے میں آتے ہی دروازہ اندر سے لاک کیا اور خود کونٹے کے سپرد کر دیا۔ وہ اپنا دکھ اسی طرح کم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا دکھ بڑھ رہا تھا وہ اپنی جگہ سے لڑکھڑاتے ہوئے بیڈ تک آئے اور آکر بیڈ پر گر گئے۔

”زندگی جہنم نہیں تھی میری بلکہ بنا دی گئی اور اس میں سارا ہاتھ آپ کا ہے ماما..... اور پاپا نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی، میں کتنا تنہا ہوں، یہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔“ وہ تقریباً چیخ رہے تھے لیکن کمرے سے آواز باہر نہیں جا رہی تھی وہ رونے لگے بالکل ایسے جیسے کوئی چھوٹا بچہ روتا ہے۔ وہ کمزور نہیں تھے لیکن اندر کی تنہائی نے انہیں کمزور کر دیا تھا۔ ان کا موبائل بچے جا رہا تھا اور کمرے میں بس ان کے خرائے گونج رہے تھے۔

☆☆☆

سردیوں کی راتیں طویل ہونے کے ساتھ ساتھ خاموشی اور پراسرار بھی ہوتی ہیں، یہ اپنے اندر تنہائی اور دکھ کا گہرا سمندر لیے ہوئے ہر ذی روح کو اداس کر دیتی ہیں اور تشمیرہ اس وقت اس تنہائی کی ہم جھولی بنی نیم اندھیرے کمرے میں بیٹھی اپنی سوچ کے تانے بانے بن رہی تھی کہ اچانک ہی دروازے پر ہلکی سی دستک سے اس کی سوچ منتشر ہو گئی، ساتھ ہی اس پر خوف بھی طاری ہو گیا کیونکہ فاطمہ، تایا جی کے سامنے محبت کا اعتراف کر چکا تھا، اب وہ بے دھڑک اس کے کمرے میں آنے کی جرات بھی کر سکتا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں مضبوطی سے بھینچ لیں۔ جبکہ ٹھنڈ کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔

”تشمیرہ بیٹا!“ تایا جی کی بہت مدھم سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ آنکھوں کی سطح نم ہونے لگی وہ

ماہنامہ پاکیزہ 166 دسمبر 2016ء



سمجھ نہیں سکی۔

”میں صبح تم سے ملنے آؤں گی۔“

”نہیں، میں گھر پر نہیں ہوں گا۔“ اس کے ساتھ

ہی اس نے لائن ڈسکنکٹ کر دی تو وہ حیران ہو کر سیٹ کو دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے اتنی عجلت کیوں دکھائی اور وہ اس سے ملنے سے کیوں کترارہا تھا اور نہ ہی ٹھیک سے بات کی تھی۔ وہ یہی سوچتے ہوئے سو گئی تھی۔

صبح اس کی آنکھ اپنے معمول پر ہی کھلی، وہ جلدی سے بیڈ سے اٹھی اور الماری سے کپڑے نکال کر واش روم چلی گئی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ یونیورسٹی نہیں جا رہی تھی اس لیے جلدی جا کر اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے ٹوٹس بھی لینے تھے۔ وہ تیار ہو کر نکلی تو سامنے فاطمہ اس کے بیڈ پر بیٹھا اس کا منتظر تھا اس پر خوف کی چادر تن گئی۔

”آج میرے ابا جی آرہے ہیں، بتا ہے کیوں؟“ وہ مسکراتا ہوا اسے دیکھ کر کہنے لگا۔ وہ جڑبڑسی ہو کر بیک میں اپنی چیزیں رکھنے لگی۔

”میری اور تمہاری شادی کی بات کرنے۔“ وہ خود ہی بتا کر ہنسا تھا، ٹھمیرہ ایک جھٹکے سے اپنا بیک اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھی اور ایک نظر حقارت سے اسے دیکھ کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

”بس کچھ دن ہی اور..... پھر تمہارے سارے کس بل نکال دوں گا۔“ وہ اپنی ایک آنکھ کی پتلی کو سیڑھیا ہوا خود کلامی کے انداز میں بولا تھا۔

☆☆☆

ریہال کو نہ جانے کیوں ٹھمیرہ کا انتظار تھا اس لیے اپنے تمام پروگرام کینسل کر کے وہ گھر پر ہی موجود تھا اور ہر آہٹ پر چونک جاتا جبکہ کل خود ہی فون پر اسے آنے سے منع بھی کر چکا تھا اور ٹھمیرہ کو تو معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ شفٹ کر چکے تھے پھر بھی وہ منتظر تھا۔

اسی کا نام شاید محبت ہے جو انسان کو بے بس کر دیتی ہے ماہنامہ پاکیزہ 167 دسمبر 2016ء

نکل گئے تو وہ تایا جی کے پیچھے بند دروازے کو دیکھنے لگی دل پر جو بوجھ تھا وہ بھی آہستہ، آہستہ سرکنے لگا تو وہ بھی اب نئے سرے سے سوچنے لگی گوکہ حالات ابھی بہت زیادہ نہیں بگڑے تھے ابھی معاملہ اس کے اختیار میں تھا اس کی ہامی اور انکار کے بعد ہی کسی نتیجے پر سب کو پہنچنا تھا لیکن اس کے باوجود اس کے اندر تائی جی کے ڈرو خوف کی جود یوار تھی وہ جوں کی توں کھڑی تھی اسے وہ چاہتے ہوئے بھی نہیں گرا سکتی تھی۔

”کل یونیورسٹی میں ریہال سے معاملہ ڈسکس کروں گی۔“ اس نے دل میں سوچا اور آنکھیں سختی سے بند کر لیں گوکہ نیند نہیں آرہی تھی لیکن وہ اب سونا چاہتی تھی لیکن اچانک ہی اس کے پاس رکھا موبائل بجنے لگا تو وہ چونکی تھی اور ساتھ ہی موبائل اٹھا کر اسکرین پر ریہال کا نام دیکھ کر کال ریسیو کر لی۔

”شکر ہے تم نے فون تو ریسیو کیا ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ تمہاری آواز سننے بغیر ہی جرمی جانا پڑے گا۔“ اس کا انداز قنوطیت لیے ہوئے تھا۔ وہ ٹھمیرہ پر ہنسی کوئی روداد نہیں جانتا تھا کیونکہ اس پر اپنا دکھ کسی پہاڑ کی صورت ٹوٹا تھا۔

”میں کل یونیورسٹی آرہی ہوں..... پھر تمہیں بتاؤں گی کہ میرے ساتھ.....“

”میں کل یونیورسٹی نہیں آؤں گا۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر فوراً بولا۔ ”یہی بتانے کے لیے تمہیں کل سے فون کر رہا ہوں مگر تم نہ جانے کہاں مصروف تھیں جو میری کال ریسیو نہیں کی۔“

”ہاں..... وہ میں.....“ اس سے جموٹ نہیں بن پڑا تو وہ خاموش ہو گئی۔

”اچھا خیر، میں کل روانہ ہو رہا ہوں۔“

”کتنے بجے ہے تمہاری فلائٹ؟“

”شام میں ہے۔“

”وہاں سے فون کرو گے؟“

”ہاں نہیں۔“ وہ نہ جانے کیوں روٹھا ہوا تھا، ٹھمیرہ



اب دوپہر ہونے کو آئی تھی اور اس کا انتظار ختم ہونے کو نہیں آ رہا تھا بالآخر وہ خود ہی جھنجھلا اٹھا اور گھر سے باہر نکلنے سے پہلے کچن سے ذرا فاصلے پر رک کر امی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”اچھا امی، میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔“  
”پر کہاں.....؟“ وہ کچن سے نکل کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔

”ذرا یونیورسٹی فیلو سے ملنے جا رہا ہوں۔“  
”ارے بیٹا نا تم دیکھو..... اب زیادہ وقت نہیں ہے تمہاری فلائٹ میں۔“

”بس جلدی آ جاؤں گا۔“ وہ کہہ کر تیزی سے باہر کی طرف بڑھا اور ابھی دروازے سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ سامنے کھڑے اعزاز شاہ کو دیکھ کر چونک گیا۔  
”ارے بھئی تم جا رہے ہو تو سوچا تمہارے ساتھ ایک کپ چائے پی لوں۔“ وہ ریال کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ساتھ اندر لے آئے اس وقت اسے اعزاز شاہ کا آنا گراں گزر رہا تھا لیکن مجبوری تھی اس لیے کہنی دے رہا تھا۔

”میرا تو جرمی آنا جانا رہتا ہے۔“ اعزاز شاہ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بجائے ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھے تھے۔ ریال، امی کو چائے کا کہتا اعزاز شاہ کے سامنے آ بیٹھا تھا۔

”ابھی چار ماہ پہلے بھی میں وہیں تھا بہت خوب صورتی ہے وہاں.....“ وہ ایک آنکھ دبا کر شرارت سے بولے تو ریال مسکرا کر رہ گیا

”تمہارا ٹور کب تک کا ہے؟“  
”تین سال کے لیے جا رہا ہوں۔“

”تو ہو سکتا ہے اس دوران میں تم سے ملنے آؤں تو اپنے ساتھ ماں جی کو بھی لیتا آؤں۔“

”نہیں بیٹا، مجھے انگریزوں کا ملک دیکھنے کا کوئی شوق نہیں۔“ وہ چائے کی ٹرے لیے کچن سے نکلیں اور دونوں کو کپ تھا کر خود بھی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ”میری

تو بس ایک ہی خواہش ہے کہ میں اب اپنے رب کے گھر کا دیدار کروں۔“

”انشاء اللہ ضرور..... اور یہ خواہش میں آپ کی ضرور پوری کروں گا۔“ ریال نے کہا تو اعزاز شاہ کچھ سوچنے کے انداز میں اسے دیکھنے لگے وہ یہاں آتے جاتے تھے لیکن نہ جانے کیوں انہیں کچھ عجیب سا لگتا تھا ایک عجیب سی کیفیت طاری رہتی جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکے تھے لیکن ایک سکون سا ان کے دل و روح کو ملتا تھا۔

”چلو تمہاری فلائٹ کا ٹائم ہونے والا ہے۔“  
اعزاز شاہ چائے کا کپ رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ ان سے ملتا ہوا اندر کمرے سے اپنا سامان اٹھا لایا۔ امی اسے مسلسل دعائیں دے رہی تھیں۔

”بس بھی کریں ماں جی، کچھ دعائیں میرے لیے بھی رکھ لیں۔“ اعزاز شاہ نے مسکرا کر کہا تو امی کی جگہ ریال فوراً بولا۔

”آپ کے لیے تو ہم دونوں ہی ہر وقت دعا کرتے رہتے ہیں۔“

”بس اسی کی ضرورت ہے مجھے، شاید آپ لوگوں کی دعائیں ہی مجھے۔“ وہ کچھ کہتے، کہتے خاموش ہو گئے۔ اور فوراً ہی بات بدلتے ہوئے بولے۔ ”ماں جی کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو آپ مجھ سے بلا جھجک کہہ سکتی ہیں اور کسی بھی وقت ویسے تو میں روز ہی آپ کے ہاتھ کی چائے اور صبح کا ناشتا کرنے ضرور آؤں گا۔“

”ہاں تم بھی میرے بیٹے جیسے ہی ہو۔“ امی نے کہتے ہوئے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا تو ریال کے ہونٹوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی جس بات کی اسے اتنی فکر تھی اللہ نے کس خوب صورتی سے اسے اس فکر سے آزاد کر دیا تھا۔ اعزاز شاہ اس کی نظر میں کسی فرشتے سے کم نہیں تھے۔ وہ ابھی انہی سوچوں میں... گم تھا کہ اچانک موبائل فون بجنے لگا۔ اس نے چونک کر



## ملن

دسمبر کی چمکتی سردرات ہے  
چاروں اور یادوں کی بارات ہے  
تم نہ آئے آگیا بام پر چاند  
اک سلسلہ صوفشاں ہے ہجر کی سیاہ رات میں  
سیٹے ہوئے ستاروں کی قطار  
کاش ہوتا پہلو میں یار  
دیکھتا کہکشاں روشنی کی مٹی میں ہے  
سبزے نے اوڑھ رکھی ہے جگنوؤں کی شال  
اے میرے ہم نفس!  
سجائی ہے آنسوؤں نے شب وصال  
فراق کے طویل تر ہوتے موسموں میں  
خواب بھر ہو رہے ہیں  
سننے کھنک کے سور ہے ہیں  
ذرا دیکھو تو.....!  
میں اور دسمبر کے آخری پل  
مل کے  
باہم رو رہے ہیں

شاعرہ: فصیحہ آصف خان، ملتان

پر بھاری ہے اور یہ ہر انسان کو آہستہ، آہستہ دیمک  
کی طرح چاٹ رہی ہے۔۔۔ آنسو اس کی پلکوں سے  
بھاگنے لگے۔۔۔ ہر کسی کے پاس کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا  
ہے لیکن پھر وہ اپنی کوتاہی کی وجہ سے اس سے دست  
بردار ہو جاتا ہے جیسے کہ میں..... وہ خود کلامی  
کر رہی تھی۔ وہ ایک جگہ فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی۔ وہ  
نہیں جانتی تھی کہ فاطمہ اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک  
آگیا تھا اور اب اس کے فٹ پاتھ پر بیٹھنے سے کچھ  
خائف ہوا تھا۔

”کیا بات ہے یہاں کیوں بیٹھ گئیں؟“ فاطمہ کی

موبائل جیب سے نکالا اور کال ریسیو کی تھی۔

”میں تمہارے گھر کے باہر کھڑی ہوں۔“  
دوسری طرف سے تشمیرہ کی آواز ابھری تھی۔ ”لیکن  
یہاں تو کوئی اور لوگ آگئے ہیں۔“

”ہاں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”پھر تم کہاں ہو؟“

”میں اس وقت انرپورٹ کے لیے اپنے گھر سے

نکل رہا ہوں۔“ اس نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔  
کتنی دیر سے وہ انتظار کر رہا تھا اسی کے آنے کا یا اس  
کے فون کا اور اب ایک دم ہی سے کھنور بن گیا تھا امی  
جی کے ساتھ اعزاز شاہ نے بھی اسے دیکھا۔

”چلیں۔“ اس نے فوراً کہا اور ساتھ ہی  
گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے چلے  
جانا چاہتا تھا، نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا وہ خود  
نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ ایک طرف دل اس سے ملنے کو  
اور بات کرنے کو چل رہا تھا تو دوسری طرف وہ خود  
اس پر بند باندھ رہا تھا، اسی کی نظر میں اگر وہ ابھی  
کنزور پڑا تو پھر کچھ اور نہیں کر پائے گا جبکہ ابھی اس  
نے زندگی میں بہت کچھ کرنا تھا۔ یہی سوچ اسے کھنور  
اور خود غرض بنا رہی تھی۔

☆☆☆

تشمیرہ نے حیرت سے موبائل کو دیکھا تھا، وہ  
ریہال کے اس رویے کو سمجھنے سے قاصر تھی، نہ جانے وہ  
ایسا کیوں کر رہا تھا۔ وہ یہ سوچ کر واپسی کے لیے مڑی  
تھی اگر اس کی وجہ اس کا پچھلا رویہ تھا تو اس نے اب  
ایک دوست کھودیا تھا۔ دکھ نے بہت خاموشی سے اس  
کے دل میں گھر کر لیا اور وہ افسردہ سی مسکراہٹ کے  
ساتھ ایک طرف چل دی۔

”زندگی کیا ہے اشخاص کا مجمع اور ان کی  
کہانیاں..... یا پھر غم و جبر کا ایک گہوارہ ہے۔“ اس  
کے اپنے ہی الفاظ اس کی سماعتوں میں گونجنے لگے  
تھے۔ ”لیکن ان سب کے بیچ تنہائی بھی ہے جو سب



آواز پر وہ بری طرح سے چوکی تھی اور تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کچھ نہیں۔ ایک دوست سے ملنے آئی تھی۔“

”میل یا فی میل.....؟“ اس کا انداز چہمتا ہوا تھا وہ نظریں چرا گئی۔

”فی میل..... آپ یہاں کیا کرنے آئے تھے؟“

”کچھ نہیں، ایک کام سے نکلا تھا پھر تمہیں دیکھا

تو یہاں آ گیا۔“ وہ کچھ نہیں بولی خاموشی سے کھڑی نہ جانے کس بات کا انتظار کر رہی تھی۔

”گھر چلیں۔“ اس نے پوچھا تو وہ اثبات

میں سر ہلا کر اس کے ساتھ گاڑی میں پچھلی سیٹ پر

آ کر بیٹھ گئی جبکہ وہ ڈرائیو کرنے لگا یہ پہلا موقع تھا

کہ وہ مزید کچھ نہیں بولا تھا۔ گھر کے سامنے گاڑی

رکتے ہی وہ گاڑی سے اتر کر تیزی سے گھر کے اندر

داخل ہو گئی تھی۔

”میں نے تھمیرہ کو بہت نازوں سے پالا ہے،

مجھے امید ہے کہ اسے آپ لوگ کوئی تکلیف نہیں

دیں گے۔“ اسے لاؤنج سے گزرتے ہوئے تایاجی کی

آواز سنائی دی۔ نہ جانے وہ کس سے کہہ رہے تھے، وہ

نہ چاہتے ہوئے بھی سننے لگی۔

”آپ بے فکر رہیں بھائی صاحب! ہم اسے

اپنی بیٹی ہی سمجھیں گے اور اسے مان بھی دیا ہی

دیں گے۔“

”ٹھیک ہے ابھی اس کی تعلیم جاری ہے اس لیے

ہم فی الحال منگنی کی رسم کر لیتے ہیں۔“

اس پر دکھ کے ساتھ سکتہ طاری ہو گیا تھا اسے

یقین نہیں آ رہا تھا کہ تایاجی اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے

جارے تھے، وہ بھی اس کی مرضی کے بغیر..... وہ

جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھتی چلی گئی جبکہ پیچھے آتے فاطر

نے اسے تھامنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اس سے پہلے ہی

ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

جب اسے ہوش آیا تو تایاجی اس کے سر ہانے بیٹھے تھے، وہ اپنے کمرے میں بیڈ پر لیٹش ہوئی تھی اور نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا تایاجی بھی غنودگی میں تھے اس لیے اس کے ہوش میں آنے سے بے خبر تھے اس نے سر اٹھا کر تایاجی کو دیکھا اس وقت وہ کہیں زیادہ بوڑھے لگ رہے تھے۔ ان چند دنوں میں انہوں نے اپنا خیال رکھنا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ تھمیرہ نے ایک دم ہی ان کا ہاتھ تھام لیا تو وہ ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگے۔

”کیا ہوا بیٹا، کچھ چاہیے؟“

”نہیں تایاجی۔“ وہ رونے لگی۔

”روتی کیوں ہو، ابھی تو میں زندہ ہوں۔“

”آپ کو میری عمر بھی لگ جائے۔“ وہ فوراً بولی

اور بہ مشکل اٹھ کر ان کے گھٹنوں کے پاس بیٹھ گئی۔

”میں یہ منگنی نہیں کر سکتی۔“

”کیوں؟“

”آپ سب جانتے ہیں پھر بھی مجھے ایسے شخص

سے منسوب کر رہے ہیں۔“

”ابھی صرف نسبت طے ہو رہی ہے تاکہ اسے

لگام دے سکوں اور اس کے ساتھ تمہاری تائی جی کو

بھی..... باقی وقت پر چھوڑ دو۔“ تایاجی اس کے سر پر

ہاتھ رکھ کر شفقت سے بولے تو وہ ذرا سا سراسر اٹھا کر انہیں

دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، بس اپنا

آپ بے مایہ لگ رہا تھا۔

”مجھ پر بھروسہ رکھو جلد ہی سب کچھ ٹھیک

ہو جائے گا بس تم میرا ساتھ دو۔“ تایاجی کی اس

بات کے دوران فجر کی اذان کی آواز آنے لگی تو اس

نے چند لمحوں سوچنے کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

تایاجی کے چہرے پر مطمئن سی مسکراہٹ آ کر ظہر گئی

وہ اس کا سر تھپکتے ہوئے نماز کے لیے اٹھ کھڑے

ہوئے تھے۔

(باقی آئندہ)

ماہنامہ پاکیزہ 170 دسمبر 2016ء  
WWW.PAKSOCIETY.COM